افکارِ اقبال اور مسلم اُمّہ کا تصوّر

محمد انور صوفی

مسلم امّہ کا تصور

اقبالؒ کو ہمارے قومی تشخص میں اہم حیثیت حاصل ہے۔ ہماری معاشرتی زندگی کی تشکیل میں ان کے افکار اساسی حوالے ہیں۔ ہمارے نظریہ وطن یعنی دوقومی نظریے کی پہچان ہیں۔ اگر پاکستان سے اقبال اور فکر اقبال کا حوالہ نکال دیں، باقی صرف جغرافیائی سرحدیں رہ جائیں گی۔ اگر کسی ملک یا معاشرے کی نظریاتی سرحدیں باقی نہ رہیں تو جغرافیائی سرحدیں بھی بے معنی ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بعض نادان دوست، ہمارے ملک اور معاشرے کو اقبالؒ سے بے بہرہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان نادان دوستوں کی کوششیں کامیاب نہیں ہوں گی۔

ایک پاکستان کیا، دنیا بھر کے مسلمان ممالک، بلکہ غیر مسلم ممالک میں بسنے سے مسلمان بھی فی الوقت شدید دباؤ کا شکار ہیں۔ انھیں کہا جا رہا ہے کہ وہ اپنی شناخت اپنی اپنی جغرافیائی سرحدوں کی چار دیواری تک محدود رکھیں۔ اور اپنے ذہن سے مسلم امّہ کے تصور کو جھٹک دیں۔ ''خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی'' کے تصور کی بجائے قوموں کی تشکیل کے وطنی نظریے کو اپنا لیں۔ گویا تسلیم کر لیں کہ ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں''، اور ادیان یا اعتقادات یا نظریات کی بنیاد پر نہیں۔ یہ وہی نعرہ ہے، جو تحریک آزادی ہند کے دوران، ایک عالم دین نے لگایا تھا تو علامہ نے ان کے تمام تر احترام کے باوجود، سخت ترین الفاظ میں اس نظریے کو رد کر دیا تھا۔

قوموں کی تشکیل کے بارے میں، مسلمانوں کو، اُن کے اسلامی نظریات سے ہٹانے کے کام کی ابتدا ترکی سے ہوئی۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی نے ایک بڑی طاقت کا رول ادا کیا۔ سلطنت عثمانیہ، خلافت کے اسلامی تصور پر قائم تھی۔ اور دنیا بھر کے مسلمان، اس خلافت کو اپنے روحانی اور سیاسی مرکز کے طور پر، نہ صرف تسلیم کرتے تھے، بلکہ اس کا احترام بھی کرتے تھے۔ سلطنت عثمانیہ اگر قائم رہتی تو آنے والے زمانے میں، دنیا بھر کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کے کسی بھی انتظام میں اسے نمایندہ حیثیت حاصل ہوتی اور اس کو برطانیہ اور فرانس جیسے نسبتاً چھوٹے ممالک سے کہیں بڑا مقام ملتا۔ لیکن مغرب کو مستقبل کے کسی نقشے میں اسلام اور مسلمانوں کا وجود گوارا نہیں۔ اس لیے ایک طرف اگر مشرقی یورپ کی اسلامی ریاستوں پر روسی تسلط کو قبول کر لیا گیا، تو دوسری طرف یونان کو بھڑکا کر قبرص کا مسئلہ پیدا کیا گیا۔ اسی طرح بلقان میں یوگوسلاویہ کو آگے بڑھایا گیا اور سب سے بڑھ کر عربوں کو عربیت کے نام پر بے وقوف بنایا گیا۔ جب ترکی دباؤ میں آ گیا، یعنی اسے محدود کر دیا گیا، تو وہاں ایک سیکولر

انقلاب کے ذریعے ترک معاشرے کا اسلامی تشخص ختم کرا دیا گیا۔ مگر اب اکیسویں صدی میں وہ پھر اپنے اسلامی تشخص کی بحالی کے لیے سرگرداں ہے۔ بیسویں صدی کے شروع میں ترکی کو ایک بڑی طاقت کا درجہ حاصل تھا مگر اب یورپی برادری میں بھی اس کی شمولیت بہ حیثیت ایک دست نگر ملک کی ہے۔ یورپی یونین کی رکنیت کے آثار دور دور تک نظر نہیں آ رہے۔ موجودہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں اپنی نمایندگی اور مستقل نشست سے وہ محروم ہے، اور نہ جانے کب تک محروم رہے گا۔

برصغیر جنوبی ایشیا (یعنی متحدہ ہندستان) میں تحریک آزادی، اس تحریک میں مسلمانوں کے اہم اور نتیجہ خیز کردار، مسلمانانِ ہند کے اسلامی تشخص پر اصرار، مطالبہ پاکستان اور تحریکِ حصول پاکستان اور قیام پاکستان کے بعد ترکی سے پاکستان کے دوستانہ تعلقات وغیرہ کے بارے میں ہماری نئی نسل اور خاص طور پر ناروے میں پروان چڑھنے والی ہماری نژادِ نو، کس حد تک باخبر ہے؟ نہیں معلوم۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری اپنی نسل بھی شاید اس بارے میں کچھ معلومات تو رکھتی ہے، مگر ان کی اہمیت کے ادراک سے عاری ہے۔

پاکستان کے اندر اور پاکستان سے باہر آپ کو پاکستانیوں کی نمایندگی کا دعویٰ کرنے والے ایسے بہت سے رہنما اور دانشور، بہ آسانی مل جائیں گے جو پوری دیانتداری کے ساتھ، اَب بھی، یہ یقین رکھتے ہیں کہ قیام پاکستان کا مطالبہ درست نہ تھا۔ اس کے باوجود لوگ، اُن کو اپنا راہ نما تسلیم کرتے ہیں، بلکہ پاکستان کی تقدیر اُن کو سونپنے کو تیار ہیں۔ علامہ اقبال ترکی میں خلافت کی بحالی کو ممکن نہیں سمجھتے تھے، لیکن عالمِ اسلام کے لیے ایک مرکز کے قیام کے پُرجوش حامی بلکہ داعی تھے۔ علامہ، اپنے وقت کے دیگر راہنماؤں اور عام لوگوں کی طرح سلطنت عثمانیہ کے زوال اور مسلمانوں کی پے در پے شکستوں پر دل گرفتہ رہتے تھے۔ آپ نے سقوطِ طرابلس پر جو انتہائی پُرسوز نظم لکھی اور بادشاہی مسجد میں منعقدہ ایک احتجاجی جلسۂ عام میں پڑھی، اُسے سُن کر، مجمع جذبات کی شدت میں بے چین و مضطرب ہو گیا تھا اور اس نظم میں علامہ نے بیان کیا ہے کہ فرشتے جب اُن کو بزم رسالت میں لے گئے تو حضورﷺ نے، اُن سے پوچھا:

نکل کے باغِ جہاں سے بہ رنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

تو جواباً علامہ نے فرمایا:

حضورؐ، دہر میں آسودگی نہیں ملتی　　تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گُل ہیں ریاضِ ہستی میں　　وفا کی جس میں ہو بُو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں　　جو چیز اس میں ہے، جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں　　طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ہر وہ شخص جو علامہ سے عقیدت کا دم بھرتا ہے اور علامہ کے کلام و پیام سے معمولی سی بھی آشنائی رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اقبال مسلمانوں کے باہمی اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ مزید یہ کہ شاعر انسانیت بھی تھے۔ آپ اس عالم کے ایک ایک فرد کے لیے باعزت زندگی کے تمنائی تھے۔ افراد کی شخصی اور اقتصادی آزادی اور یکساں ذرائع روزگار کی فراہمی کے زبردست حامی تھے۔ آپ اتحاد اقوام سے کہیں زیادہ وحدت آدم پر یقین رکھتے تھے۔ ضرب کلیم میں شامل ایک نظم کا عنوان ہے ''مکہ اور جنیوا''۔ اس میں علامہ فرماتے ہیں:

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام　　پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریق مِلل، حکمتِ افرنگ کا مقصود　　اسلام کا مقصود، فقط ملتِ آدم
مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام　　جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم؟

اس نظم میں نہ صرف اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک فرد کی حیثیت کو متعین کر دیا گیا ہے، بلکہ یہ اشارہ بھی دیا گیا ہے کہ جمعیت اقوام (Leage of Nations) اصل میں انسانوں کو انسانوں سے جُدا کرنے، اور اُن کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑانے اور مرنے مارنے پر آمادہ کرنے کا ایک طریقۂ واردات ہے۔ یہ حکمت فرنگیوں کی اسی حکمت عملی کا نتیجہ ہے کہ ایک ہی برعظیم یورپ میں رہنے والے، ایک ہی دین کے ماننے والے، تقریباً ایک جیسا معاشرتی نظام رکھنے والے عوام کو قومیت کے جغرافیائی اور وطنی نظریے کی بنیاد پر ایک دوسرے کے ساتھ لڑایا اور ایک دوسرے کے ہاتھوں مروایا گیا۔ علامہ اسی باعث دیارِ مغرب کے اس تہذیبی نظام کی کامیابی سے مایوس تھے۔ اور اپنے اس احساس کا اظہار، آپ نے، اپنے قیام یورپ (۱۹۰۵ـ۱۹۰۸ء) کے دوران ہی، اپنی ایک غزل (مارچ ۱۹۰۷) میں کر دیا تھا:

تمھاری تہذیب، اپنے خنجر سے، آپ ہی خودکشی کرے گی

اس کے برعکس علامہ کا پختہ ایمان تھا کہ آنے والا زمانہ اسلام کا زمانہ ہے۔ بنی نوع انسان کے تمام تر مسائل کا حل اسلامی تعلیمات میں مضمر ہے۔ دنیا میں اسلام کو اپنی اصل روح کے ساتھ پیش کرنا امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے اسی لیے علامہ نے اپنی نظم ''طلوعِ اسلام'' میں فرمایا ہے:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اور اپنی اسی بات کو سیاسی رنگ میں ''ضرب کلیم'' کی نظم ''جمعیت اقوام مشرق'' میں دہرایا ہے۔

طہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

علامہ چاہتے تھے کہ ہندستان میں بسنے والے مسلمان، دنیا بھر کے مسلمانوں کو متحد اور متحرک

کرنے کی ذمہ داری کو قبول کریں اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں۔ علامہ ہوا میں تیر چلانے کے قائل نہیں تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ اس کام کی تیاری کے لیے جس قسم کے وسائل درکار ہوتے ہیں، وہ بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ اور آزاد ممالک کی خودمختار اور نمایندہ حکومتیں ہی فراہم کرسکتی ہیں۔ علامہ کو معلوم تھا کہ حکومتی اقدامات کو قانونی جواز فراہم کرنے کا تسلیم شدہ طریقہ جمہوریت میں پوشیدہ ہے۔ اسی لیے علامہ، جمہوری حکومت میں پارلیمنٹ کی بالادستی پر یقین رکھتے تھے۔ یہی وہ کام تھا جس کے لیے ایک تجربہ گاہ، پاکستان کی صورت میں فراہم کرنا ضروری تھی علامہ کے اس خیال اور تصور سے، نہ صرف پاکستان کے نظریے کی ابدیت عیاں ہوتی ہے بلکہ یہ بھی سمجھا جاسکتا کہ کشمیری مسلمانوں کو اُن کے سوادِ اعظم سے کاٹ کر رکھنے، فلسطین میں مسلمانوں کی اپنی ریاست کی مخالفت میں اور چیچنیا میں، عوام کی اپنی ایک آزاد اور جمہوری حکومت کے قیام کی مخالفت میں کون سی مشترکہ حکمت عملی کارفرما ہے۔

خود مسلمانوں کو شاید اس میں کوئی شک ہو، مگر ہمارے ''کرم فرما'' اس امر سے غافل نہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں سے روح محمد ﷺ کو نکالنا کیوں ضروری ہے، علامہ کی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' علامہ کی آخری کتاب ''ارمغان حجاز'' کے حصہ اردو کی پہلی نظم ہے۔ اسے پڑھ لیں، معاملہ آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ یہ نظم بھی بہ اندازِ تمثیل لکھی گئی ہے۔ منظر یہ ہے کہ ابلیس نے اپنے مشیروں کا ایک اجلاس بلا رکھا ہے، اجلاس کا ایجنڈا ہے ابلیسی نظام کو درپیش خطرات کی نشاندہی اور اُن کی روک تھام۔ ابلیس کے مشیر، ملوکیت سے جمہوریت تک کے انسانی سفر کو خطرہ قرار دیتے ہیں، اور سرمایہ داری نظام اور اشتراکیت کو ابلیسی نظام کا توڑ قرار دیتے ہیں۔ لیکن ابلیس اُن سب سے اختلاف کرتا ہے اور اُن کو سمجھاتا ہے کہ یہ سب قدیم و جدید نظام، میرے اپنے ہی بنائے ہوئے ہیں۔ مقصود ان سے یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھیں کہ اب وہ میرے چنگل سے نکل رہے ہیں، جبکہ اصل میں میری گرفت ان پر مزید سخت ہو رہی ہے۔ میں نے تو مسلمانوں کو بھی بے عملی کی ترغیب دے کر اور ان میں، فرقہ واریت کو ہوا دے کر، ان کے ایمان کی تیغ جگر دار کو کند کر دیا ہے۔ اس کے باوجود اگر مستقبل میں کسی نظریے کسی اصول اور کسی نظام سے مجھے حقیقی خطرہ محسوس ہوتا ہے، تو وہ آرزو کی اس چنگاری سے ہے جو اب بھی بے عمل اور بے یقین مسلم امہ کی بجھی ہوئی راکھ میں پوشیدہ ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ عصر حاضر کے تقاضے مسلمانوں پر پیغمبر ﷺ کی وہ شرع آشکار نہ کر دیں جسے میں نے اپنی حکمتِ عملی اور تدابیر سے ان سے پوشیدہ کر رکھا ہے۔ وہ آئین پیغمبر ﷺ جس سے کہ ابلیس بھی پناہ مانگتا ہے اور نہیں چاہتا کہ مسلمانوں پر آشکار ہو جائے، وہ آئین یہ ہے:

الحذر! آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر　　حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے　　نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف　　منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب　　پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اسی پر بس نہیں، ابلیس اپنے وہ طریقے، حربے اور وہ نسخے بھی اپنے مشیروں کو بتاتا ہے، اُن کے سامنے اپنی اس حکمت عملی کے نکات بیان کرتا ہے، جن کو اپنا کر مسلم امہ کو بے یقینی میں مبتلا رکھا جا سکتا ہے۔

حکیم الامت نے تو اپنا فرض ادا کرتے ہوئے ہمیں ابلیسی ارادوں اور منصوبوں سے آگاہ کر دیا اور یہاں تک فرما دیا کہ جس منبر سے یہ صدا بلند ہو کہ ملت وطن سے ہے، وہ منبر مقام محمد عربی ﷺ سے بے خبر ہے۔ اس کے برعکس ہمارا کردار و عمل یہ ہے کہ مسلمان یا مسلمان حکومتیں، اسلام اور مسلمانوں کے کھلے یا چھپے دشمنوں کے لیے محض ایک تر نوالہ بن چکی ہیں۔ دنیا بھر کے مسلمان ملک قومیت کا زمینی نظریہ اپنا چکے ہیں۔ عرب ممالک نے تو اسی بنیاد پر اپنی ایک علیحدہ تنظیم عرب لیگ بھی قائم کر رکھی ہے۔ ہمارے اپنے ملک سے مشرقی پاکستان کو اسی نظریے کے تحت علیحدہ کرایا گیا۔ اور اب پاکستان میں اسی نظریے کی اشاعت اور تبلیغ کی عیارانہ کوششیں، انتہائی مکارانہ طور پر ہو رہی ہیں۔

اس لیے حالات کا تقاضا ہے کہ ہم اس صورت حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں۔ اس کا ایک آسان اور سیدھا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اقبالؒ کے مزید قریب کریں۔ اقبالؒ کو سمجھنے کے لیے پڑھیں، اور جو سمجھ میں آئے اسے دل سے قبول کریں اور جسے دل سے قبول کیا جائے اس پر عمل بھی کیا جائے۔ اس موقع پر مجھے ایک وہ تاجک پروفیسر اکبر ترسون زادہ یاد آ رہے ہیں جن کے ساتھ میری ملاقات ۱۹۹۱ء میں قرطبہ، سپین میں منعقد ہونے والی اقبال کانفرنس کے دوران ہوئی تھی۔ اپنا مقالہ پیش کرنے سے پہلے انھوں نے سامعین و حاضرین کو بتایا تھا کہ اقبالؒ ہماری روزمرہ معاشرتی، ثقافتی اور سیاسی زندگی کے بہت قریب ہے۔ ہم اسے ایک زندہ مقامی شاعر محسوس کرتے ہیں۔ ہم اس کی نظمیں اپنے قومی نغموں کی طرح گاتے ہیں۔ ایک وقت میں ہماری مذہبی اور سماجی اقدار کو تباہ کر دیا گیا تھا۔ ہمارے لیے معلومات کا خلا پیدا کر دیا گیا تھا۔ اس وقت بھی اقبالؒ ہمارے لیے حوصلہ اور امید کا سرچشمہ تھا۔ آج ہم آزاد ہیں، تو اقبالؒ کی ضرورت اور زیادہ شدت سے محسوس کرتے ہیں، اور یہ اچھا ہے کہ وہ اپنے کلام کی صورت میں ہماری رہنمائی کے لیے ہمارے پاس موجود ہیں۔

میرے نزدیک سوال یہ نہیں کہ فکر اقبال عصر حاضر میں با معنی ہے یا نہیں؟ سوال یہ بھی نہیں کہ اقبالؒ کتنا بڑا شاعر ہے سوال یہ بھی نہیں کہ اقبال کن کن شعرا سے بڑا ہے اور کون کون اقبال کے بعد بڑے شاعر ہیں یہ سب، اور ان سے ملتے جلتے سوالات تو صرف ہمیں الجھانے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اقبالؒ کا جو بھی مرتبہ و مقام ہے، وہ ہماری وجہ سے نہیں ہے۔ نہ ہی ہمارے ماننے یا نہ ماننے، یا

اسے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے اقبالؒ کی عظمت پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ میرے نزدیک اہم سوال صرف یہ ہے کہ کیا تاجکی پروفیسر اکبر کے اشارات سمجھ سکتے ہیں؟ میرا جواب، اس ضمن میں مثبت ہے۔ کیونکہ میرا ایمان یہ ہے کہ ہم، اقبالؒ کی سرزمین کے ویران کھیت تو ہو سکتے ہیں، مگر بنجر اور بانجھ نہیں ہیں۔ اقبالؒ ہی کے بقول:

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

.....

(یہ مضمون ۱۰ نومبر ۲۰۰۲ء کو بزم احباب پاکستان، ناروے کے زیر اہتمام یوم ولادت اقبالؒ کے سلسلے میں، اوسلو ناروے میں منعقدہ ایک تقریب میں پڑھا گیا۔)